مولانا سیّد سلیمان ندوی اور علاّمہ اقبالؒ

محمّد معزّالدین

سید سلیمان ندوی اردو ادب، تاریخ، مذہب، ثقافت، تحقیق، تفسیر اور سوانح پر لکھنے والے ان چند اکابر میں سے ہیں جن کا نام لئے بغیر ہمارے اردو ادب اور دین و مذہب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ مولانا سید سلیمان ندوی دارالعلوم ندوہ کے فارغ التحصیل اور مولانا شبلی کے شاگرد رشید بلکہ صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ اور آپ علامہ اقبال کے ان چند معاصرین میں سے تھے جنہوں نے علامہ اقبال پر تنقید بھی کی ہے اور ان کی تعریف و تحسین بھی۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری کے مصداق انہوں نے ان کے کلام اور ان کے خیالات کو دیکھ کر یہ پرکھ لیا تھا کہ "موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے" جیسا مصرعہ تو کہنے والا شاعر اردو شاعری کے میدان میں ذاتی انداز میں داخل نہیں ہوا ہے بلکہ روایت سے بغاوت کر کے وہ ہماری شاعری کے لئے ایک نئی آواز ہے۔ اس کی شاعری آگے چل کر نہ صرف "بانگِ درا" بلکہ "بالِ جبریلؑ" اور "ضربِ کلیم" بھی ثابت ہو گی۔

علامہ کی معرکۃ الآرا مثنوی رموزِ بے خودی جب پہلی بار شائع ہوئی تو مولانا سید سلیمان ندوی نے اپریل ۱۹۱۸ء کے "معارف" میں اس پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا۔ گو اس سے پہلے سے دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ جاری تھا۔ مولانا علاّمہ اقبالؒ کے کلام کا جو مختلف رسالوں میں چھپتا رہتا تھا مطالعہ کرتے اور ان کی شاعری کے مداح تھے۔ وہ اس تبصرے میں لکھتے ہیں کہ "مدت سے ارادہ تھا کہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری پر ایک انتقادی نظر ڈالی جائے لیکن کثرت مشاغل اور قلت فرصت نے موقع نہ دیا۔ ابھی ان کی ایک مثنوی "رموزِ بے خودی" موصول ہوئی ہے اس تقریب سے اب خیالات کے عرض کا کسی قدر موقع مل گیا ہے" اس مضمون میں آگے چل

کہ مولانا نے لکھا ہے کہ "ابتداء سے ڈاکٹر اقبال کی زبان، اشکال پسند اور ترکیب آفریں واقع ہوئی۔ کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لئے انہوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں نظمیں لکھیں"۔ ظاہر ہے کہ یہ تبصرہ ان کے ابتدائی کلام پر کیا گیا ہے۔ ویسے اس وقت ان کی شاعری کو خاصی مدت ہو گئی تھی۔ اور مولانا نے اسی مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ ان کی پہلی مثنوی "اسرار خودی" ان کی نظر سے نہیں گزری۔ مگر اس کے چند اجزا انہوں نے ان مضامین کی وساطت سے دیکھے تھے جو اس پر ناقدین نے لکھے تھے۔ اور حکیم افلاطون اور حافظ کو بزو گوسفند" لکھنے پر معترضین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی تھی جس نے علامہ کو مذہب سے بیگانہ تصور کر کے ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع کر دی تھی۔

راہب اول افلاطون حکیم — از گروہِ گوسفندان قدیم
ہوشیار از حافظ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار
گوسفند است و وغا آموخت است — فتنہ جو ناز و ادا آموخت است

ایسے اشعار سے لوگ برہم تھے۔ اور علامہ کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔ "اسرار خودی" پر مولانا جیراجپوری کا تبصرہ الناظر میں ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کا شکریہ علامہ اقبال نے اپنے خط میں کیا تھا۔

مثنوی "رموز بے خودی" پر مولانا نے ایک عالمانہ تبصرہ کیا تھا۔ اس سے نہ صرف ان کے تبحر علمی اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ علامہ اقبال کی قدر شناسی اور خود مولانا کی شعر فہمی کا بھی۔ کیونکہ بقول صائب سکوت سخن شناس سے بھی شعر کی بے قدری ہوتی ہے۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را — تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

اور اس سلسلے میں مولانا نے جو نکتہ پیدا کیا ہے اس کا جواب نہیں۔ مولانا نے "کائنات" کے اسرار و حقائق کی تعلیم و تلقین کے چار راستے بتائے ہیں۔ مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری۔ اور اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اور تاریخی ارتقاء بتاتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ مختلف رستے الگ الگ تھے مگر بعد میں عجمی صوفیوں کے زیر اثر مذہب، شاعری، فلسفہ اور تصوف، سب کا ایک آمیزہ تیار ہو گیا۔ اور ان کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں حکیم سنائی نے ابتدا کی اور مولانا روم نے اسے عروج دکھائی

بخشا ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "چوتھی صدی سے لے کر دسویں صدی کے شعرا اہل باطن نے ہم کو جو کچھ سمجھایا، قرآن پاک اور حدیث قدسی کی جو کچھ تفسیریں انہوں نے کیں، ہمارے عالمانہ غیظ و غضب فاتحانہ جوش و خروش، اور مجاہدانہ زور و قوت کو اعتدال پر لانے کے لئے وہ ضروری تھا لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہمارے مشتعل قویٰ سرد ہو گئے ہیں۔ ہمارے خون کی گرمی محکومانہ برودت سے بدل گئی ہے، ہمارے قویٰ میں مفتوحانہ ضعف آگیا ہے، اس حالت میں اگر اسی پرانے نسخے کا استعمال جاری رہا تو برد اطراف کے بعد شاید وہ برد قلب کا باعث ہو جائے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ہمارے اہل دل شعرا، مثنوی مولوی روم کا ایک دوسرا نسخہ ہمارے لئے تیار کریں۔" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کے لئے چن لیا۔ انہوں نے اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی۔ پھر مولانا فرماتے ہیں کہ "زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو ان شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین کتابیں قربان ہیں۔ مصرعوں کے دروبست اور فصل و وصل میں تصرف ممکن ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرعہ ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اتر جائے، شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفے، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں، اور اس لئے اختلاف مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بچ کر نکل نہیں سکتا"

مولانا نے لطیف پیرایہ میں مذہب، فلسفے، تصوف اور شاعری سب کا احاطہ کر کے، علامہ اقبال کی شاعری کا جو بنیادی مقصد تھا اس کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا ہے۔ مولانا کے اس ابتدائی قول کا وزن اور بڑھ جاتا ہے جب خود علامہ کے اس شعر کو سامنے رکھئے۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست   سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

کیونکہ رموز بے خودی کا اصل مقصود بھی علامہ نے خود ملت اسلامیہ کے اسرار حیات کی تشریح بتائی ہے۔

مولانا نے بعض تعقید لفظی و معنوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تسلیم کیا تھا کہ "ڈاکٹر اقبال

نے جو اسرار و نکات اس میں حل کئے ہیں، ان کی بنا پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فن قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید علم کلام کی ایک بہترین کتاب بھی ہے"۔ علامہ نے مولانا سے خواہش ظاہر کی تھی کہ ان غلطیوں کی نشاندہی کر کے بھیج دیں تاکہ وہ اس کی اصلاح کر لیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجئے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے (اقبال نامہ، ص ۸۲)۔ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہؒ کے حصہ اوّل میں علامہ اقبال کے چھوٹے بڑے ستر (۷۰) خطوط شامل ہیں جو اس کتاب کے ۱۲۶ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور جن سے دونوں کے باہمی ربط اور خلوص کے ساتھ عالمانہ تبادلہ خیالات اور مختلف علمی، مذہبی اور فقہی مسائل پر ان کی آراء اور استفسارات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ حصہ ایسا ہے کہ الگ کتابچے کی شکل میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی کے خطوط بھی شامل کر دیں تو یہ بڑی ادبی اور علمی خدمت ہوگی۔ اہل دیسنہ یا دیسنہ ایسوسی ایشن والے اگر اس کی طرف توجہ کریں تو یہ کام مشکل نہیں۔

۱۹۱۶ء میں علامہ نے مولانا کو اورینٹل کالج لاہور میں پرشین ٹیچر کی حیثیت سے آنے کی دعوت دی تھی جسے انہوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ علامہ نے لکھا تھا کہ "آپ کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لئے مفید ہوگا۔"

علامہ اقبال نے مولانا کی علمی بصیرت کی قدر کرتے ہوئے اور علوم اسلامیہ کی ترویج کا انہیں امام مانتے ہوئے اپنے ایک خط مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۳۳ء میں لکھا تھا کہ "علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد تھے ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟"
(اقبال نامہ ص۱۶۶)

ایک خط میں علامہ اقبال نے مولانا کی ایک غزل کے اس شعر کی بڑی تعریف کی ہے۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں　　　وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی نے جس طرح تاریخی واقعات کو نظم کرنے کی کوشش کی تھی اقبال نے مولانا کو بھی اس سلسلے کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ مولانا کے کلام کا کوئی مجموعہ

میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر اب تک طبع نہ ہوا ہو تو ادھر بھی توجہ درکار ہے۔

یہ تمام خطوط دو ایسے دانشوروں کی آپس کی علمی گفتگوؤں پر مبنی ہیں جن سے آج ہم پر علم و آگہی کے سینکڑوں راستے کھلتے ہیں۔ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی عالمانہ دوستی نے ایک دوسرے کو جو فیض پہنچایا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس طرح مولانا سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال دو ایسے نابغۂ فن تھے جنہوں نے ایک دوسرے سے مستقل استفادہ کیا۔ مولانا سلیمان ندوی کے خطوط سامنے نہیں، مگر علامہ اقبال کے جو خطوط زیر نظر ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال مولانا کی کس قدر عزت کرتے تھے اور ان کی عظمت اور دقتِ نظر اور شعر و ادب میں تحقیقی اور مذہبی امور میں ان کے فرمودات کو قول فیصل سمجھ کر ان کی عظمت کا برملا اعتراف کرتے اور ان سے استفادہ کی برابر کوشش کرتے تھے۔ علامہ لکھتے ہیں "میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا۔"

علامہ اقبال نے آپ کی نسبت ایک جگہ لکھا ہے کہ "آپ امت محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس مامور من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امر الٰہی ودیعت کیا گیا ہے۔" (اقبال نامہ، ص ۹۸)۔ بعض ایسے مذہبی امور میں جہاں علامہ کو شک ہوتا تھا تو مولانا کی طرف رجوع کرتے۔ مثلاً اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء میں لکھتے ہیں کہ "دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلاء کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لئے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لے آتے ہیں، یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں۔ کیا یہ مال مسلمان کے لئے حلال ہے" معلوم نہیں مولانا نے کیا جواب دیا۔ مگر اس سے اتنا تو اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ مولانا کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام کا تذکرہ جب چھپا تو اس کے دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد "الہلال" کے پریس مینجر نے یہ لکھ دیا کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک "الہلال" کی آواز بازگشت ہیں" اس پر علامہ نے احتجاج کیا اور داد خواہی کے لئے مولانا کو مخاطب کیا اور اپنے ایک خط میں لکھا کہ "بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری، البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں

اقبال تحریک اسلامی سے پہلے مسلمان نہ تھا، تحریک "الہلال" نے اسے مسلمان کیا۔"

مولانا سید سلیمان ندوی جب ۱۹۲۰ء میں سفر یورپ سے واپس آئے تو مراجعت پر تہنیت پیش کرتے ہوئے علامہ نے ان کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا "آپ نے بڑا کام کیا ہے، جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے۔ اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔" اسی طرح سیرۃ عائشہ کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔" (اقبال نامہ، ص ۱۱۳) کبھی متکلمین کے متعلق کبھی مرزا غالب کے شعر کے مفہوم کے متعلق کبھی کسی اور موضوع پر استفسار کرتے ہیں۔ مثلاً "کیا حکمائے صوفیۂ اسلام میں سے کسی نے زمان و مکان کی حقیقت پر بھی بحث کی ہے؟" (اقبال نامہ۔ ص ۱۱۵)

مرزا غالب کے جس شعر کا مفہوم علامہ نے پوچھا تھا وہ یہ ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود   رحمۃ اللعالمینے ہم بود

اور دریافت فرماتے ہیں کہ "حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔ اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لئے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخ اشراق تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے۔ ان کے اس عقیدہ کی وجہ یہی تو نہ تھی؟"

معراج کے متعلق مولانا نے اظہارِ خیال فرماتے ہوئے علامہ اقبال کے خیالات کی ان الفاظ میں وضاحت فرمائی ہے "معراج کے جسمانی اور روحانی ہونے کی بحث نہایت فرسودہ اور پامال ہے اور ڈاکٹر اقبال اس فرسودہ و پامال بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ تاہم ان کے نزدیک دنیا کے تمام واقعات صرف مادی علل و اسباب کے پابند نہیں ہیں بلکہ روحانی طاقت بھی بہت سے واقعات کا سبب بن سکتی ہے۔ اور معراج خواہ جسمانی ہو یا روحانی لیکن وہ بہر حال ایک روحانی طاقت کا نتیجہ تھی۔ اس لئے بذاتِ خود وہ ایک روحانی چیز تھی اور جسمانی حالت میں بھی روحانی طاقت اس کی محرک تھی۔

علم کلام میں یہ ایک خشک اور بے اثر مسئلہ تھا لیکن ڈاکٹر اقبال نے اس کے ذریعہ

سے مسلمانوں کو روحانی طاقت کی نشو ونما اور بلند ہمتی کا سبق دیا" (سید سلیمان ندوی" مقالات یوم اقبال" ۱۹۳۸ء، ص ۲۴-۲۵)

مفتی جان عالم جان ایک روسی مسلمان مصلح عالم کے حالات پر جب معارف میں مولانا کا مضمون چھپا تو اس کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مسلم اسٹنڈرڈ لندن نے ان کے کچھ حالات شائع کئے تھے۔ آج کے معارف میں میری آرزو سے بڑھ کر مضمون لکھا گیا جزاک اللہ۔ معارف کا ایڈیٹر صاحب کشف نہ ہوگا تو اور کون ہوگا۔"

اسی طرح "پیام مشرق" پر جو رائے مولانا نے دی تھی اس کی بابت علامہ لکھتے ہیں کہ "پیام مشرق پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

پروفیسر نکلسن کا خط بھی آیا ہے۔ انہوں نے اسے پسند کیا ہے۔ اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اور بجبل خیالات سے مملو ہے۔ اور گوئٹے کے دیوان مغربی کا قابلِ تحسین جواب ہے۔ مگر میرے لئے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابلِ افتخار ہے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں "جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لئے کافی ہے۔" (اقبال نامہ، ص ۱۲۲)

کبھی مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری کے رسالے تحقیق زمان کے متعلق دریافت فرماتے ہیں جو کبھی مولانا اسمٰعیل شہید کی "عبقات"، قاضی محب اللہ کے "جوہر الفرد" اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تصانیف کے متعلق پوچھتے ہیں کہ کہاں سے دستیاب ہونگی۔

ضمناً عرض ہے کہ عربی رسالہ اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان مصنفہ علامہ سید برکات احمد کا اردو ترجمہ محمود احمد برکاتی صاحب نے نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ یہ رسالہ اقبال اکادمی کی طرف سے چھپ چکا ہے۔ اس رسالے کی دستیابی کے متعلق علامہ اقبال نے مولانا سلیمان سے دریافت کیا تھا۔ کیونکہ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ زمان ومکان و حرکت کی بحث اس وقت فلسفہ اور سائنس کے مباحث میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ "اسلامی حکماء اور صوفیہ کے نقطۂ نگاہ سے یورپ کو روشناس کرایا جائے"۔

اور وہ ایک مضمون بعنوان "زمان کی حقیقت، فلسفہ اسلام کی تاریخ میں" لکھ رہے تھے۔ اور اس سلسلے میں مسلسل مولانا سے استفسارات کرتے تھے۔ ایک جگہ علامہ نے مولانا کی انشا پردازی اور نثر کی خوبیوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "معارف مجھے خاص طور پر محبوب ہے اور بالخصوص آپ کے مضامین کے لئے کہ آپ کی نثر معانی سے معمور ہونے کے علاوہ لٹریری خوبیوں سے بھی مالامال ہوتی ہے"۔

اسی طرح علامہ مشرقی کی کتاب "تذکرہ" جب چھپی تو اقبال نے اس کے بارے میں مولانا کی رائے دریافت کی۔ اور لکھتے ہیں کہ "زمیندار میں تذکرہ پر ایک ریویو مفصل شائع ہوا ہے جو مصنف نے محنت و کاوش سے لکھا ہے۔ مگر سید سلیمان ندوی کی اسٹائل اور وسعت نظر اس کو حاصل نہیں"۔ فقہ اسلامی سے متعلق ایک کتاب لکھنے کی مولانا سے علامہ اقبال نے ان الفاظ میں خواہش ظاہر کی تھی" اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا؟" (ص، ۱۶۶)۔ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال انشاء اللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا" (ص ۱۵۲)

شاہ افغانستان نادر شاہ کی دعوت پر علامہ اقبال مولانا سلیمان ندوی اور سر راس مسعود افغانستان میں تعلیم مذہبی کے متعلق مشورہ دینے تشریف لے گئے تھے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم "مسافر" میں نادر شاہ سے اس ملاقات کا نہایت موثر انداز میں حال لکھا ہے اور مولانا نے "سیر افغانستان" کی تفصیل "سفرنامۂ کابل" میں دلچسپ انداز میں تحریر فرمائی ہے۔ ۸ ستمبر ۱۹۳۳ء میں علامہ نے مولانا کو لکھا تھا کہ شاہ افغانستان آپ سے تعلیم مذہبی کے بارے میں مشورہ چاہتے ہیں۔ شاید اسی ماہ ستمبر میں آپ کو کابل سے دعوت آئے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ جانے کے لئے تیار ہوں گے۔ ممکن ہے کہ سر راس مسعود اور اقبال بھی آپ کے ہمراہ ہوں۔" (۱۶۷)

مولانا کی کتاب "عمر خیام" پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "عمر خیام پر آپ نے جو

کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم کیا اضافہ کر سکے گا۔ الحمدللہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔" علامہ اقبال کے خطوط سے ان چند اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مولانا کے بارے میں اس بلند پایہ شاعر فلسفی، مفکر اور مسلمانوں کا درد رکھنے والے علامہ اقبال کے تاثرات کیا تھے۔ یعنی مولانا سلیمان ندوی نہ صرف علامہ شبلی نعمانی کے جانشین تھے بلکہ یکتائے روزگار عالم اور بلند پایہ انشاء پرداز اور معقولات وفقہ کے استاد الاساتذہ اور تحقیق وتاریخ کے جید عالم اور ادب وسیاسیات کے ماہر تھے۔

علامہ اقبال کی دلی خواہش تھی کہ کاش مولانا کے ساتھ کچھ روز رہنے کی صورت نکلتی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ گو بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر مولانا، سر راس مسعود اور علامہ اقبال کے ساتھ نہ جا سکے مگر افغانستان میں جو وقت ان کے ساتھ گزرا اس سے علامہ نے فائدہ اٹھایا جس کی تفصیل مولانا کے مضمون "سیر افغانستان" میں ملتی ہے۔ اور واپسی کا راستہ دو عالموں کی عالمانہ باتوں میں لطف وکیف کے ساتھ گزر گیا۔ سیر افغانستان میں مولانا نے لکھا ہے کہ "عجیب اتفاق کہ راستہ تو خطرناک درپیش تھا اور ڈاکٹر اقبال صاحب نے روحانیت کے ذاتی مشاہدات وتجربات اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی، گفتگو طرفین سے نہایت دلچسپ ہو رہی تھی۔ اس عہد کے مختلف شیوخ اور بزرگان سلاسل کا تذکرہ رہا، اس ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حیات خفتہ کے تاروں میں جس مضراب نے حرکت پیدا کی ہے وہ خود ان کے والد ماجد کی ذات بابرکات تھی۔"

مولانا سلیمان ندوی اور علامہ اقبال کا تقابلی جائزہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ دور حاضر میں اسلامی احیاء اور مسلمانوں کے افکار میں اجتہاد ووسعت پیدا کرنے کی دونوں نے جو کوششیں کی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

مولانا نے سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے ۱۹۲۵ء میں مدراس کے انگریزی مدرسوں کے طالب علموں اور عام مسلمانوں کے سامنے پیش کئے۔ جو خطبات مدراس کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ The living prophet کے نام سے ہوا تھا۔ اس کے مترجم سعید الحق دسنوی مرحوم تھے یہ اب ناپید ہے۔ اس کی دوبارہ اشاعت ہو

جائے تو یہ نیک کام ہوگا۔ اور علامہ اقبال نے بھی مدراس میں ان کے بعد ۱۹۲۸ء میں انگریزی میں The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے عنوان سے چھ لکچر دیئے جس کا ترجمہ تشکیل الہیات جدید کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔

علامہ اقبال کو مولانا سے بے حد گرویدگی اور شیفتگی تھی۔ ان کے علمی مرتبے کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبال نے آپ کے حسن اخلاق اور کردار کی عظمت سے متعلق بھی اپنی عقیدت مندی کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "آپ قلندر ہیں مگر وہ قلندر جس کی نسبت علامہ اقبال نے کہا ہے۔

قلندران کہ براہ تو سخت می کوشند — زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند — بخلوت اند و زمان و مکان در آغوشند
دریں جہاں کہ جمال تو جلوہ ہا دارد — زفرق تا بقدم دیدہ و دل و گوشند
بہ روز بزم سراپا چو پرنیاں و حریر — بہ روز رزم خود آگاہ و تن فراموشند